اقبالؒ پر داغ کے اثرات

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو سو دل میں ہے

لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اقبال فکری اعتبار سے دنیا کے متعدد فلسفیوں سے متاثر ہوئے ہیں اور شعری اعتبار سے دنیا کے کئی شعرا سے جن میں اردو کے شعرا بھی شامل ہیں۔ ہرمن ہیسی نے اقبال کو تین اقلیموں کا شاعر کہا ہے اور ہیسی کے بقول ان تین اقلیموں میں سے ایک اقلیم قدیم ہندوستانی فلسفہ ہے۔ دوسری اقلیم ہے یورپی فلسفہ اور تیسری اقلیم ہے اسلامی فلسفہ۔ لیکن یہ تو فلسفے کی بات ہوئی۔ شاعری کا جہاں تک تعلق ہے اقبال متعدد شعرا سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور ان کے کلام کے اکثر حصوں پر اُن شعرا کی چھاپ نظر آتی ہے جیسے "شکوہ" پر میر تقی میر کی واسوخت کا اور "پنجاب کا جواب" پر میر انیس کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم بالخصوص اس موضوع پر بات کرتے ہیں کہ داغ کے اقبال پر کیا اثرات رہے ہیں تو ہمارے پیشِ نظر یہ حقیقت ہوتی ہے کہ داغ، اقبال کے استاد تھے اور اقبال نے ایک مدت تک داغ کے رنگ میں غزلیں کہی ہیں۔

یہاں ایک بات جملۂ معترضہ کے طور پر میں یہ عرض کر دوں کہ بقول سید نذیر نیازی 'شاعری میں اقبال کے پہلے استاد مولوی میر حسن ہیں۔ اگرچہ میں اپنے ایک مقالے میں اس بات کی تردید کر چکا ہوں اور اس سلسلے میں میری دلیل یہ ہے کہ اقبال کے اپنے بیان کی روشنی میں اس بات کی واضح تردید ہمیں نظر آتی ہے لیکن چونکہ یہ دعوے سید نذیر نیازی نے کیا ہے اس لئے اسے نظر انداز کرنے کے عوض میں نے یہ سوچا کہ بر سبیلِ تذکرہ ہی سہی، اس کا ذکر یہاں کر دوں۔

گویا راقم الحروف کے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری میں اقبال کے پہلے اور آخری استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی تھے۔ ایک آدھ شعر پر مشورہ لینے کی بات دوسری ہے۔ مشورہ تو وہ نواب مرزا رشد گورگانی سے بھی لیتے رہے۔ میرے استاد شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم نے مجھے بتایا تھا اور لاہور کے بعض اور

صاحبِ نظر حضرات نے اس کی تائید کی کہ علامہ کا یہ شعر ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اپنی اصل صورت میں یوں تھا ؎

کبھی اے حقیقتِ مُستَتَر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

مولانا غلام قادر گرامی نے پہلے مصرعے میں لفظ "مُستَتَر" کو بدل کے "منتظر" کر دیا۔ لاہور کے بعض معمر حضرات جو اس واقعے کی تائید کرتے تھے، گرامی مرحوم کا ایک خاص پنجابی جملہ دہراتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا کرتے تھے۔ اور وہ جملہ یہ ہے:

"اوئے ڈاکٹر صیب! اے مُستَتَر کیہ لفظ ہویا۔ منتظر سامنے دا لفظ اے۔ ایہدا تینوں خیال ای نئیں آیا؟"

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "اسرارِ خودی" کا مسودہ علامہ نے اشاعت سے قبل سارے کا سارا مولانا گرامی مرحوم کو دکھایا تھا۔ راقم التحریر کے علم میں یہ بات نہیں کہ گرامی نے "اسرارِ خودی" کے کسی شعر یا مصرعے میں کوئی تبدیلی کی یا نہیں۔

اسی طرح پروفیسر آرنلڈ کے مشورے پر علامہ مرحوم نے اپنی پہلی تصنیف "علم الاقتصاد" کا مسودہ علامہ شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ مولانا شبلی نے اس مسودے میں جا بجا ترمیم و تصحیح کی تھی جس کا اقبال نے خود "علم الاقتصاد" کے دیباچے میں اعتراف کیا ہے، مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نثر میں علامہ شبلی اور اقبال میں اُستاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔

لیکن داغ مرحوم کے ساتھ اقبال کا تعلق دوسرا تھا۔ انھوں نے باقاعدہ داغ کو خط لکھ کے ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس ضمن میں سر عبدالقادر "بانگِ درا" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"شعرائے اردو میں ان دنوں نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کا بہت شُہرہ تھا اور نظامِ دکن کے اُستاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ جو ان کے پاس جا نہیں سکتے تھے خط و کتابت کے ذریعہ دُور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں اُن کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے۔ پچھلے زمانہ میں جب ڈاک کا یہ انتظام نہ تھا کسی شاعر کو اتنے شاگرد کیسے میسّر آ سکتے تھے۔ اب اس سہولت کی وجہ سے یہ حال تھا کہ سینکڑوں آدمی اُن

سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انھیں اس کام کے لیے ایک علمہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انھیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لیے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فنِ غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ گو اس وقت ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی مگر جنابِ داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دُور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجایش بہت کم ہے اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر تک قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبولِ عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انھوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے۔"

(۲)

عام طور سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ جب ہم کسی شاعر کی زمین میں شعر کہتے ہیں تو اس سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات کبھی کبھی صحیح بھی ہو لیکن ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کسی نے مصرع طرح دیا ہے اور ہم اس مصرع پر غزل کہتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ یہ کس شاعر کا مصرع ہے اور اگر معلوم ہو بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ شاعر ہمارا پسندیدہ شاعر نہ ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصرع طرح نہ دیا جائے لیکن ہمارے تحت الشعور میں کوئی مصرع ہو اور ہم اس پر غزل کہیں۔ اس صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے فلاں شاعر سے متاثر ہو کر اس زمین میں غزل کہی ہے۔

لیکن یہ بات اقبال اور داغ کے تعلق سے نہیں کہی جا سکتی۔ داغ کا اپنے اُستاد کے طور پر اقبال نے خود انتخاب کیا تھا اور ایسے وقت میں جب اکبر اور حالی ایسے شعرائے دنیائے ادب میں موجود تھے۔ اکبر اور حالی وہ شاعر ہیں جن کے ساتھ اقبال مزاجی طور پر ہم آہنگ ہیں۔ داغ کے ساتھ اقبال کی فکری یا مزاجی ہم آہنگی نہیں ہے لیکن اس کا انکشاف اقبال پر غالباً ذرا بعد میں ہوا۔

اقبال جب سیالکوٹ میں تھے اور یہ ۱۸۹۵ء سے پہلے کی بات ہے اُس وقت اقبال ایک تو داغ کے اس غلغلے سے

متاثر ہوئے ہوں گے جو اُس زمانے میں ملک کے طول و عرض میں برپا تھا دوسرا داغ کی زبان کے چٹخارے سے، اور پھر ہو سکتا ہے کہ انھیں مولوی میر حسن یا دوسرے بزرگوں نے مشورہ بھی یہی دیا ہو کہ داغ کے شاگرد بن جاؤ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس مشورے کو قبول کرنے میں اقبال کی اپنی رضامندی کو بھی دخل رہا ہوگا۔

یہ دراصل اقبال کے لڑکپن کا دور تھا اور اقبال نے ابھی تک اپنی آواز کی دریافت نہیں کی تھی اس لئے انھوں نے کمالِ فن اسی کو سمجھا کہ داغ کے انداز میں، داغ کی زمینوں میں غزل کہیں۔ اُس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ داغ ان کے اعصاب پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور یہ بات داغ کی زمینوں میں کہی ہوئی غزلوں کے علاوہ اُس قسم کے اشعار سے بھی ظاہر ہے:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

جنابِ داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

گرم ہوتا ہے کبھی ہم پہ جو وہ بُت اقبال!
حضرتِ داغ کے اشعار سُنا دیتے ہیں

(۳)

لیکن دراصل اقبال ایک نو دمیدہ پودے کی طرح مختلف اطراف سے اثرات قبول کر رہے تھے۔ پودا زمین سے بھی اثر لیتا ہے، سورج کی روشنی سے بھی، دوسرے فضائی عناصر سے بھی لیکن اِس اثر پذیری میں مالی کی دیکھ بھال کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ سنگترے میں مالٹے کا پیوند لگا کر اسے کینو کی شکل دے دیتا ہے۔ ایک پھول میں دوسرے پھول کا رنگ و بُو شامل کر کے ایک نیا پھول معرضِ وجود میں لے آتا ہے۔ یہی اثر داغ کا اقبال کے کلام پر ہوا اور کچھ مدت تک داغ کے تربیت یافتہ اقبال کی شاعری داغ کے رنگ میں بھی رہی اور اُس پر اقبال کا اپنا رنگِ طبیعت بھی کبھی کبھی شب خُون مارتا رہا جس سے اقبال بہت دن تک بے خبر رہے۔

اقبال کی ابتدائی شاعری کے زمانے میں غالب کی معنی آفرینی بھی اُن کے سامنے تھی اور اُن کا اوجِ تخیل بھی۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

حالی کی غزل بھی ان کی نظر سے گزری ہوگی اور مقدمۂ شعر و شاعری بھی، امیر مینائی کی شاعری بھی ان کے سامنے ہی، بلکہ لاہور کے ایک مشاعرے میں جو بازارِ حکیماں میں منعقد ہوا، اقبال امیر مینائی کی زبان سے ان کا کلام بھی سن چکے تھے اور ایک دور میں بات یہاں تک بھی پہنچی تھی کہ:

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر و اقبال
میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

جب اقبال کی ابتدائی زمانے کی شاعری کا ذکر ہوتا ہے تو ۹۶-۱۸۹۵ء کی ایک غزل کے اس شعر کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے:

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس شعر میں "اسیر" اور "خمِ زلف" کی موجودگی کے باوجود یہ شعر اس خمِ زلف کی اسیری سے آزاد ہے جو حضرتِ داغ کی دین ہو سکتی تھی۔ اس کا انداز مختلف ہے اور اقبال تخلیقِ شعر کے بارے میں جس انداز سے سوچ رہے تھے اس کی طرف ماری رہنمائی خمِ زلف کے ذریعے سے نہیں ہو رہی ہے بلکہ خمِ زلفِ کمال کے ذریعے سے ہو رہی ہے لیکن اس غزل کے قی چند اشعار دیکھیے۔ داغ کا تتبع واضح طور پر نمایاں ہے:

تم آزماؤ "ہاں" کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے
کم بخت اک "نہیں" کی ہزاروں ہیں صورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوالِ وصال کے
جادو عجب نگاہِ خریدارِ دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے
ہم موت مانگتے ہیں وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے انھوں نے اور ہی معنی وصال کے
مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کر
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے

اقبالیات

ان کی گلی میں اور کچھ اندھیرا ہو نہ جائے
اے ضعف! دیکھ مجھ کو گرا نا سنبھال کے

چلتے ہوئے کسی کا آنچل جو سرک گیا
بولی حیا حضور! دوپٹہ سنبھال کے

حسرت نہیں کسی کی تمنا نہیں ہوں میں
مجھ کو نکالیے گا ذرا دیکھ بھال کے

میں نے کہا کہ بے دہنی اور گالیاں؟
کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے

کہتے ہیں ہنس کے جائیے ہم سے نہ بولیے
قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے

بگڑے حیا نہ شوخیٔ رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے

تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال کے

لیکن اب اسی غزل کے یہ دو شعر دیکھیے:

اے ضبط ہوشیار مرا حرفِ مدعا
قابو میں آ نہ جائے زبانِ سوال کے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ان دو اشعار کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ صوفی صد داغ کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اگر چہ ان میں ہلکی سی اغ کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے لیکن اِن میں اُس اقبال کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نظر آ رہی ہے جو بعد میں نگِ داغ کی شاعری سے بیزار ہونے والا تھا۔ قریب قریب یہی بات مجھے اس شعر کے بارے میں بھی کہنا ہے:

کہتا ہے خضرِ دشتِ جنوں میں مجھے کہ چل
آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے

یہ شعر اسی فکر و فن کا امتزاج ہے جو پورے دس برس بعد اس شعر کی صورت میں ظاہر ہوا:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اب اس غزل کے ساتھ ہی داغ کی بعض زمینوں میں اقبال کی چند غزلیں دیکھیے۔

داغ کی ایک غزل ہے:

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا
حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

یہ داغ کی ۱۴ شعر کی غزل ہے۔ اس زمین میں اقبال کے صرف چار شعر ملتے ہیں۔ یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ داغ کی اکثر مختصر غزلوں کے مقابلے میں اقبال نے بہت طویل غزلیں کہی ہیں:

کبھی جزوِ فطرت ہے اہلِ ستم کی
کبھی ہم نے خنجر کو سیدھا نہ دیکھا
بہت تُو نے اے آنکھ! دیکھے تماشے
جسے دیکھنا دیکھنا تھا نہ دیکھا
ظہور و عدم اپنا مثلِ شرر تھا
یہ سمجھو کہ دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
اگرچہ پھرا میں بہت اس چمن میں
کسی نے مرا آنا جانا نہ دیکھا

اب داغ کی ایک اور غزل دیکھیے:

بزمِ گلشن میں نہ کھلنا گلِ تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

یہ غزل مقطعے کے بغیر ہے اور آخری شعر ہے:

کوئی دم کوئی گھڑی کل نہیں پڑتی دل کو
میں بیاں کس سے کروں آٹھ پہر کی صورت

اقبال کہتے ہیں:

تُو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت
میں نہاں تجھ سے ترے مُوئے کمر کی صورت

خیر کیا بات ہے پتھر ہے اگر دل تیرا
ہم بھی اس سنگ میں رہتے ہیں شرر کی صورت

گوچۂ عشق کے یہ راہنما بنتے ہیں
اللہ اللہ کوئی دیکھے تو خضر کی صورت

وصل کی رات تو آخر ہوئی اے دامنِ صبر
چاک ہو تو بھی گریبانِ سحر کی صورت

گر پڑا شیشۂ دل سنگِ درِ جاناں پر
یہ بھی ٹوٹے گا یہیں کاسۂ سر کی صورت

خون اب دل میں نہیں اے رہِ الفت باقی
ختم ہو تو بھی کہیں زادِ سفر کی صورت

کیوں نہ آنکھوں پہ بٹھاؤں تجھے اے روزنِ در
تو دکھاتا ہے کسی رشکِ قمر کی صورت

میں تو دیوانہ ہوا خیر کوئی بات نہ تھی
آپ کیوں پھر گئے لیکن مرے سر کی صورت

ہو شگفتہ ترے دم سے چمنِ دہر تمام
سیر اس باغ کی کر بادِ سحر کی صورت

نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام
زندگی چاہیے دنیا میں شرر کی صورت

یہ تو بتلا دے مؤذن کہ تری آنکھوں سے
کیا مروت بھی گئی خوابِ سحر کی صورت

جوش میں بحرِ محبت تھا، مگر دل اپنا
صاف نکلا نگہِ دیدۂ تر کی صورت

دہر میں ذوقِ سکوں تجھ کو ہے پیغامِ فنا
تازہ رکھ جوشِ سفر شمس و قمر کی صورت

ضربِ شمشیرِ حوادث سے نہ کھو قوتِ ضبط
سخت خوددار ہو دنیا میں سپر کی صورت
ہے گل و لالہ کی صورت تو انھی سی لیکن
ان میں یہ سوز نہیں قلب و جگر کی صورت
لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

اب یہ غزل واضح طور پر دو حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے دونوں حصوں میں کچھ بُعدِ زمانی بھی حائل ہو۔ پہلا حصہ جو اس شعر پر ختم ہو رہا ہے:

میں تو دیوانہ ہوا خیر کوئی بات نہ تھی
آپ کیوں پھر گئے لیکن مرے سر کی صورت

ہر اعتبار سے رسمی اور عامیانہ شاعری کی مثال ہے اور جسے میں نے دوسرا حصہ کہا ہے (حالانکہ غزل میں حصے نہیں ہوتے) اس میں اقبال کے کئی تصورات جنھوں نے بعد میں مکمل طور پر نظریات کی صورت اختیار کی، شعر میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص ان اشعار میں جو خیالات ادا ہوئے ہیں وہ بعد میں اقبال کے نظامِ فکر کا جزو بنے:

نام روشن تو رہے عمر ہو گو برقِ خرام
زندگی چاہیے دنیا میں شرر کی صورت
دہر میں ذوقِ سکوں تجھ کو ہے پیغامِ فنا
تازہ رکھ جوششِ سعیِ شمس و قمر کی صورت
ہے گل و لالہ کی صورت تو انھی سی لیکن
ان میں یہ سوز نہیں قلب و جگر کی صورت

داغ کا ایک سہ غزلہ ہے جس کے مطلعے یہ ہیں:

کر گیا تاثیر نالہ بلبلِ ناشاد کا
ہاتھ لینا پاؤں اب جمتا نہیں صیاد کا

اور

پہ نہ باندھے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا
کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

اور

ہو اثر اتنا تو سوزِ نالۂ فریاد کا
ہم تماشا دیکھ لیں گھر پھونک کر صیاد کا

اقبال نے اس زمین میں دو غزلیں کہی ہیں جن میں سے ایک بقیدِ یک قافیہ ہے:

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوۂ بیداد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اڑ اڑ کر جو گھر صیاد کا

کس بتِ پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مبتلا
حسرتِ دل پر ہے برقع دامنِ فریاد کا

جب دعا بہرِ اثر مانگی تو یہ پایا جواب
غیر رو کر لے گئے حصہ تری فریاد کا

ہوں وہ ناداں ڈر سے زیرِ دام پنہاں ہو گیا
دور سے چہرہ نظر آیا اگر صیاد کا

سُن کے اسکو بے رخی سے بھاگ جاتا ہے مدام
کیا اثر معشوق ہے اے دل تری فریاد کا

شرم جب آئی مری رگ میں لہو نکلا نہ کچھ
آب میں ہے غرق گویا عنصرِ فصاد کا

قمریوں نے باغ میں دیکھا ہے اس خوش قد کو کیا
ہے چھڑی ان کے لیے پتہ ہر اک شمشاد کا

بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جورِ و ستم
میں تو دیوانہ ہوں اے اقبال تیری یاد کا

اور دوسری غزل جو بقیدِ یک قافیہ ہے یہ ہے:

کام بلبل نے کیا ہے مانی و بہزاد کا
برگِ گل پر اُس نے فوٹو لے لیا صیاد کا

پہلے یہ بیگانگی ہم کو نظر آئی نہ تھی
سبزۂ گلشن پہ سایہ پڑ گیا صیاد کا

داغ کے اثرات اقبالؒ پر

چلتے چلتے باغ میں بلبل نے یوں گل سے کہا
تجھ کو گلچیں کا مبارک مجھ کو گھر صیاد کا

کچھ کدورت ہے دلوں کی کچھ دھواں آہوں کا ہے
یہ زمین و آسمان ہے خانۂ صیاد کا

یادِ گلشن ہے زباں پر لب پہ ذکرِ آشیاں
داغِ ہجرِ گل جگر میں دل میں ڈر صیاد کا

بیکسوں کے پاس کون آئے قفس میں ہمصفیر
یادِ گل آتی ہے یا آتا ہے ڈر صیاد کا

ہائے کس کس لطف سے ظالم نے بہلایا مجھے
بھول کر گلچیں سے پوچھا تھا پتہ صیاد کا

چلتے چلتے خارِ گل سے کیوں اٹک جاتا ہے یہ
دل کسی بلبل کا ہے دامن مگر صیاد کا

قتل کرتا ہے مجھے آتا نہیں ہے دل میں رحم
آہنی مقراض کا ہے دل مگر صیاد کا

ہوں کبھی اس شاخ پر میں اور کبھی اس شاخ پر
ناک میں آیا کو دم آیا میرے صیاد کا

ہو گیا اقبال قیدی محفلِ گجرات کا
کام کرتے ہیں جہاں انسان بھی صیاد کا

یہ دونوں غزلیں مکمل طور پر میں نے اپنے اس خیال کی تائید میں درج کی ہیں کہ اقبال کے بعد کے دور کا فکر و فنی اقبال کے
ں دور کی شاعری میں کبھی کبھی اپنی جھلک دکھاتا ہے، ہمیشہ نہیں اور یہ دونوں غزلیں اس جھلک سے خالی ہیں جس سے یہ
یان ہو سکے کہ اس شاعر کا کلام آئندہ چل کے ارتقا کی قابلِ ذکر منزلیں طے کرے گا۔

داغ ــــ

کس دلِ بیتاب کی یا رب تماشائی ہوئی
وہ نگاہِ شوق کچھ پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

اقبال ــــ

دل کو ذوقِ دید سے جب دم شناسائی ہوئی
آنکھ محشر کے نظارے کی تمنائی ہوئی

سر کے بل راہِ مدینہ میں جو میں چلنے لگا
شوق پہ صدقے تمنائے جبیں سائی ہوئی

شوقِ گلزارِ مدینہ دل میں گھر کرنے لگا
خواہشِ جنت چھپی پھرتی ہے شرمائی ہوئی

چاک جب دستِ محبت نے کیا دامانِ بیم
حسنِ مخفی سے نگاہوں کو شناسائی ہوئی

میرے اندازِ تپیدن نے اسے بہکا دیا
جانتی ہے موت اپنے آپ کو آئی ہوئی

ہو گئی شرحِ رموزِ اتحادِ حسن و عشق
تیسری یکتائی ہی آخر میری یکتائی ہوئی

لوگ بدنامِ محبت کہتے ہیں اقبال کو
غازۂ رخسارِ شہرت جس کی رسوائی ہوئی

داغ —

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

اقبال —

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم

اچھی کہی شکایتِ جور و جفا کی بھی
اتنی سی بات کے لیے محشر میں جائیں ہم

اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تو کس کا ناز ہے کہ تجھے بھی اٹھائیں ہم

پوچھیں گے آج سرمہ دنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم
ہر چیز منع تو ہے ہمیں اے طبیب عشق
لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم

یہ غزل جب مخزن (جنوری ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوئی تو اس میں بھی پانچ شعر تھے جو اوپر درج ہیں۔ بعد میں مندرجہ ذیل تین اشعار شیخ اعجاز کے ذریعے سے فقیر سید وحید الدین تک پہنچے اور ان کی وساطت سے ہم آپ تک،

دشمن شبِ فراق میں ہے اپنا آپ ہی
آجائے موت اپنی تو گنگا نہائیں ہم
ڈرتے تھے جس کے واسطے وہ بات اب کہاں
تو ایک اب کہے تو تجھے سو سنائیں ہم
اقبال شعر کے لیے فرصت ضرور ہے
اس فکرِ استعمال میں غزل کیا سنائیں ہم

یوں تو یہ ساری غزل اقبال کے متروک کلام کا حصہ ہے لیکن غالباً پہلی منزل پر انہوں نے یہی تین شعر حذف کیے ہوں گے۔ شاید اس وقت بھی انہیں پسند نہ آئے ہوں۔ بعد میں جب "بانگِ درا" زیرِ ترتیب تھی تو اس وقت انہوں نے ساری غزلیں ہی نظر انداز کرنا مناسب سمجھا۔

داغ ــــ

دھمکیاں تو ہمیں وہ روزِ جزا دیتے ہیں
ہم دہائی تری یا بارِ خدا دیتے ہیں

اقبال ــــ

جان دے کر تمہیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہیں کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں
کوچۂ یار میں ساتھ اپنے سلایا اُن کو
بختِ خفتہ کو مرے پاؤں دعا دیتے ہیں

بدگمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے
قسمیں سو لیتے ہیں جب ایک پتا دیتے ہیں

رحم آتا ہے ہمیں قیس کی عُریانی پر
دھجیاں دامنِ صحرا کی اڑا دیتے ہیں

موت بازار میں بکتی ہے تو لا دو مجھ کو
ہم نشیں کس لیے جینے کی دعا دیتے ہیں

ایسی ذلّت ہے مرے واسطے عزت سے سوا
خود وہ اُٹھ کر مجھے محفل سے اُٹھا دیتے ہیں

غیر کہتے ہیں کہ یہ پھول گیا ہے مردہ
قبر پر میری جو وہ پھول چڑھا دیتے ہیں

موت بولی جو ہوا کوچۂ قاتل میں گذر
سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں

اُن کو بیتاب کیا غیر کا گھر پھونک دیا
ہم دعائیں تجھے اے آہِ رسا دیتے ہیں

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بُت اقبال
حضرتِ داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں

داغ ——

مزے عشق کے کچھ وہی جانتے ہیں
کہ جو موت کو زندگی جانتے ہیں

اقبال ——

محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں
اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں!

نرالے ہیں انداز دنیا سے اپنے
کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں

کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دل!
محبت کو آزادگی جانتے ہیں!

حسینوں میں ہیں کچھ وُہی ہوش والے
کہ جو حُسن کو عارضی جانتے ہیں

جو ہے گلشنِ طور اے دل تجھے ہم
اسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں

یہ اس غزل کی وہ صورت ہے جو "مخزن" (جولائی ۱۹۰۱ء) میں قارئینِ "مخزن" کے سامنے آئی۔ اس غزل کے دوسرے شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تقلید کو خودکشی سمجھنے والا مضمون اقبال کے احساس میں ایک مدت سے کروٹیں لے رہا تھا۔

اس غزل کے دس شعر جو اقبال نے یہ غزل "مخزن" کو اشاعت کے لیے بھیجتے وقت نظرانداز کر دیے تھے یہ ہیں:

وہ کیا قدر جانیں گے میری وفا کی
کہ ہوتے ہیں جو آدمی جانتے ہیں

بُری چال ہوتی ہے بے اعتنائی
یہی ہم تو اچھی بُری جانتے ہیں

کہا ماجرا اُن کے گھر کا تو بولے
قسم ہے تجھے ہم دلی جانتے ہیں

بڑے شوخ و گستاخ ہیں رند زاہد
مسلماں کو دوزخی جانتے ہیں

تری چال دیکھی ہوئی ہے جنھوں نے
قیامت کو اک دل لگی جانتے ہیں

میں ہوں صاف گو، مُنہ نہ کھلوایئے گا
تمہاری وفا کو سبھی جانتے ہیں

گداگر ہو اور بال ہوں اس کے لمبے
مسلماں اسی کو ولی جانتے ہیں

بدلنا پڑا ہمنشیں! نامہ بر کو
اُسے واں کے سب آدمی جانتے ہیں

عجب زندگانی ہے اقبال اپنی
نہ مر جانتے ہیں نہ جی جانتے ہیں
کہا میں نے اقبال کو جانتے ہو
تو بولے یہ ہنس کر کہ جی جانتے ہیں

اس غزل میں تین مقطعے ہیں۔ دو مقطعے تو غزل کے مندرجہ بالا حصے میں آگئے ہیں۔ ایک مقطع اور بھی ہے جو راقم التحریر نے مولانا صلاح الدین مرحوم کی بیاض میں سے نقل کیا تھا۔ یہ مقطع شورش کاشمیری کی بیاض میں بھی درج تھا۔ مولانا صلاح الدین مرحوم جب موڈ میں ہوتے تھے تو یہ مقطع پڑھ کے زوردار قہقہہ لگایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حیرت ہے کہ اقبال کی غزل کس ابتدا سے چل کے کس انتہا تک پہنچی اور وہ مقطع یہ ہے:

نئی ہو پرانی ہو اقبال کو کیا
یہ حضرت تو بس ایک پی جانتے ہیں

مولانا صلاح الدین احمدؒ "پی جانتے ہیں" کو بار بار دھرایا کرتے تھے اور مقطع پر قہقہہ لگایا کرتے تھے۔

اب ان چند مثالوں کے بعد بعض نقاد حضرات کی یہ رائے راقم التحریر کے دل کو نہیں لگتی کہ اقبال کے یہاں داغ کے اثرات کو مطلق دخل نہیں ہے۔ داغ کا اثر اقبال کے کلام پر یقیناً ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اثر غزل کے محدود انداز میں دیرپا نہیں رہا لیکن اس کی ایک بنیادی حیثیت ضرور ہے۔ اور اقبال کی بعد کی شاعری میں یہ کہیں نہ کہیں، تنہا ایک مصرعے ہی میں سہی، اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔

خیر یہ تو تھی داغ کی زمینوں میں غزل کہنے کی بات۔ بعض دفعہ اقبال داغ سے یوں بھی متاثر ہوئے کہ اُن کی زمین میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی۔ مثلاً داغ کا ایک سہ غزلہ ہے۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے:

ہمیں کیا غم قیامت میں جو پرسش ہونے والی ہے
کہ جب وہ فتنہ گر آیا تو پھر میدان خالی ہے

دوسری غزل یوں شروع ہوتی ہے:

یہاں شکوے پہ شکوہ ہے وہاں گالی پہ گالی ہے
بہت کچھ ہوتی رہتی ہے بہت کچھ ہونے والی ہے

تیسری غزل کا مطلع یہ ہے:

غضب کے بانکپن سے تیغ ظالم نے نکالی ہے
جفا پیاروں کی پیاری ہے ترالوں کی نرالی ہے

اقبال نے قافیے میں ذرا سا تصرف کیا اور یہ غزل کہی

لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے
زباں میٹھی ہے لب ہنستے ہیں، پیاری پیاری بولی ہے

ترا اے سیلِ دریائے محبت مُنہ تکوں کب تک
مری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبو لی ہے

کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا رونا تھا میرا
کہا بے درد نے "کیوں آپ نے مالا پرو لی ہے"

جفا، جو کہہ دیا میں نے مگر تم نے بُرا مانا
خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

شبِ فرقت تصوّر تھا مرا، اعجاز تھا کیا تھا
تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

وہ میری جستجو میں پھر رہے ہیں خیر ہو یارب
پتا میرا بتانے کو قیامت ساتھ ہو لی ہے

تماشائی کوئی آئینۂ ہستی میں ہے اپنا
مزہ ہے حسن نے اے دل! کتابِ عشق کھولی ہے

سمجھ سکتا نہ تھا کوئی مجھے اس بزمِ ہستی میں
گرہ تھی زندگی میری، اجل نے آ کے کھولی ہے

جگت اُستاد ہے تو ہر آتما کو پیت ہے تیری
صنم خانے کی یارب کیسی پیاری پیاری بولی ہے

ہمیں یادِ وطن! کیا پیش آتا ہے خدا جانے
بھلا تو کس لیے غربت زدوں کے ساتھ ہو لی ہے

تغیّر روز کا کچھ دید کے قابل نہ تھا نرگس!
بتا پھر کس کے نظارے کو تُو نے آنکھ کھولی ہے

تبسّم چاکِ جیبِ گُل! ترنّم نالۂ بُلبُل
یہ بے مہروں کی باتیں ہیں یہ بے دردوں کی بولی ہے

مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ اُس کے
فلک کیا ہے کسی معشوقِ بے پروا کی ڈولی ہے
یہ ہوگی شوخ اے صیاد! مدت کی اسیری سے
نیا قیدی ہوں میں آواز میری بھولی بھولی ہے
دیارِ عشق میں واماندگی رفتار ہے اے دل!
جسے کہتے ہیں خاموشی وہ اس بستی کی بولی ہے
گماں تجھ پر ہوا تھا کیا دلِ بلبل کی چوری کا
صبا نے غنچۂ گل! کیوں گرہ تیری ٹٹولی ہے
گُل سے اے اقبال! یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل میری نہیں ہے یہ کسی گلچیں کی جھولی ہے (۱۹۰۳ء)

یہ غزل بھی "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن ایک شعر جو فقیر سید وحید الدین کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے، اس غزل میں شامل نہیں ہے اور وہ شعر یہ ہے:

سنا ہے آج جنت میں بڑی رونق کا جلسہ ہے
ترے کشتہ کا ہے نیلام اور حوروں کی بولی ہے

(۴)

اقبال مشقِ سخن کے بہت قائل تھے اور اس پر عمل پیرا بھی رہتے تھے۔ انہوں نے ایک ملاقات کے دوران میں میرے والد محترم مرحوم صاحب کو بھی یہ مشورہ دیا تھا۔ جہاں تک داغ کی مشہور غزلوں کی زمینوں کا تعلق ہے اقبال نے محض مشقِ سخن کے لیے ان کے قافیہ یا ردیف میں تبدیلی کر کے غزلیں کہی ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال استاد کی زمینوں میں بھی ایک نیاپن پیدا کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔ اور انہوں نے اُن کی زمینوں میں ذرا سی تبدیلی کر کے غزل کہنے کی مشق جاری رکھی۔ مثلاً داغ کی ایک زمین اور اس زمین میں اقبال کی غزل کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ داغ کے ایک مذکورہ سہ غزلہ کی زمین یہ ہے:

اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اقبال کی اس زمین میں غزل پہلے درج ہو چکی ہے لیکن اقبال نے پھر اس کی ردیف میں تبدیلی کی اور مندرجہ ذیل غزل کہی:

عاشقِ دیدار محشر کا تمنائی ہوا
وہ سمجھتے ہیں کہ جرم ناشکیبائی ہوا

داغ کے اثرات اقبالؒ پر

غیر سے غافل ہوا ئیں اے غود حسنِ یار
عرصۂ محشر میں پیدا کنجِ تنہائی ہوا

میری بینائی ہی شاید مانع دیدار تھی
بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا

ہائے میری بد نصیبی وائے ناکامی مری
پاؤں جب ٹوٹے تو شوقِ دشت پیمائی ہوا

میں تو اس عاشق کے ذوقِ جستجو پر مرمٹا
مائلِ فنا کہ کے جو تیرا تماشائی ہوا

تجھ میں کیا اے عشق وہ اندازِ معشوقانہ تھا
حسن خود لولاک کہ کر تیرا شیدائی ہوا

دیکھ ناداں امتیازِ شمع و پروانہ نہ کر
حسن بن کر عشق اپنا آپ سودائی ہوا

اب مری شہرت کی سوجھی ہے انہیں دیکھے کوئی
لیں کے بیں جس دم غبار کرتے رسوائی ہوا

بغض اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو
دق مگر اک خارجی سے آ کے مولائی ہوا

یا داغ کی ایک اور غزل ہے:

نگاہ پھیر کے عذرِ وصال کرتے ہیں
مجھے وہ الٹی چھری سے حلال کرتے ہیں

اس کے قافیے میں اقبال نے تبدیلی کی اور یہ غزل کہی جو "بانگِ درا" میں شریکِ اشاعت ہے:

مثالِ پرتوِ طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈیے کہ یہاں
ستم کش تپش ناتمام کرتے ہیں

بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں

غرض نشہ ہے شغل شراب سے جن کو
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ
کہ ہم تو رسم محبت کو عام کرتے ہیں

الٰہی سحر ہے پیران خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

میں اُن کی محفل عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں
جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

داغ کی مشہور غزل ہے:

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

اقبال نے اس غزل کا بھی ردیف میں تبدیلی کی ۔ قافیہ وہی رکھا اور مندرجہ ذیل غزل کہی ۔ جو اس وقت ان کے متروک کلام میں شامل ہے:

جو مضموں میرے دل سے حرف موزوں بن کے نکلے ہیں
وہی طائر بھی آخر گنبد مدفن کے نکلے ہیں

مری جاں داستاں میری کلیجہ تھام کر سننا
کہ میرے حال پر آنسو میرے دشمن کے نکلے ہیں

مسافر نچلے ہوتے ہیں کیا راہ محبت کے
متاعِ دل کو لے کر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

رفو اے بخیہ گر چاکِ محبت ہو تو کیونکر ہو
مرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

پسند آئی نہ اُن کو سیرِ نخلستانِ ایمن کی
مگر صحرائے یثرب میں وہ کیا بن ٹھن کے نکلے ہیں

کبھی اس راہ سے شاید سواری تیری گذری ہے
کہ میرے دل میں نقشِ پا ترے توسن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ اے دستِ جنوں، بادِ محبت کی
عرب میں جا کے پُرزے میرے پیرہن کے نکلے ہیں

گلستانِ جہاں میں مثلِ بلبل اُڑتے پھرتے ہیں
قلم سے شعر گویا میرے پریاں بن کے نکلے ہیں

سبب اے ہمنشیں کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا
یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

نہ تڑپایا کسی کو تیرے نظارے کے ارماں نے
کہ سارے دیکھنے والے تری چلمن کے نکلے ہیں

کیا حیراں فرشتوں کو بھی تیرے دردمندوں نے
خدا جانے تری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر ادھر کا رُخ نہیں کرتے
جو مثلِ بو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشتِ زارِ دل کو میں نے اے فلک دیکھا
ستارے بھی ترے، دانے مرے خرمن کے نکلے ہیں

جنہوں نے مثلِ شبنم اس چمن میں آپ کو دیکھا
وہی عاشق کسی کے چہرۂ روشن کے نکلے ہیں!

تماشا کی جو وسعت میں نے اپنے دامنِ دل کی
ہزاروں دشت اس گوشے میں اک دامن کے نکلے ہیں
برہمن روزِ محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو
صنم جو تھے وہ پھر دادی دامن کے نکلے ہیں
وہ مدبوحِ ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے
پرانے آشنا میری رگِ گردن کے نکلے ہیں

اٹھارہ اشعار کی یہ غزل روزگارِ فقیر جلد دوم میں شامل ہے لیکن اس غزل کے دو شعر دو اور کتابوں میں موجود ہیں اور وہ ہیں "رفعتِ سفر" اور "سرودِ رفتہ" اول الذکر کتاب میں یہ شعر درج ہے:

تعلق پھول ہیں گویا ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

اور ثانی الذکر میں یہ شعر:

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اُس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

(۵)

اب داغ کی ایک اور زمین میں غزل کہنے والے اقبال کی اپنی نمایاں جھلک دیکھئے۔ داغ کی غزل ہے:

ہائے مہمان کہاں یہ غمِ جاناں ہوگا
خانۂ دل تو کوئی روز میں ویراں ہوگا
آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

اقبال کہتے ہیں:

لاکھ سرتاجِ سخن ناطقہ ساں ہوگا
پر مرے سامنے اک طفلِ دبستاں ہوگا
عشق کی راہ میں جو کوئی قدم رکھے گا
کبھی گریاں کبھی خنداں کبھی عریاں ہوگا

کیا کہیں مستِ مے عشق کہاں ہوتا ہے
بہ در دیرِ مغاں ناصیہ کوباں ہو گا
جیتے جی سر نہ جھکائیں گے کسی کے آگے
مجھ پہ احسان نہ ہو گا تو یہ احساں ہو گا
زندگی چار دہاڑے ہے تو اس کی خاطر
بوالہوس ہو گا جو شرمندۂ احساں ہو گا
چار سو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے
شاید اس بزم میں اقبالؔ غزل خواں ہو گا

اور وہ جو میں نے چند سطور میں یہ عرض کیا ہے کہ داغ کے انداز بیان میں غزل کہنے کے باوجود اقبال کا اپنا رنگِ طبیعت کبھی کبھی اس انداز بیان پر شب خون مارتا رہا تو اس کی مثال کے طور پر اسی غزل کے دو اشعار پیش کر رہا ہوں:

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
صبح محشر ہو گا فرشتوں میں نمایاں ہو گا
مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہو گا

یہ ۱۹۰۲ء کے اشعار ہیں اور مندرجہ ذیل باقی تو اقبال نے بہت بعد میں آ کے کہی:

سحر با در گریبانِ شب اوست
دو گیتی را فروغ از کوکب اوست
نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ "ارمغانِ حجاز" کی رباعی ہے جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی لیکن مذکورہ شعر:

مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو وہ خنداں ہو گا

۱۹۰۲ء کا ہے اور خودی کا تصور بھی باضابطہ صورت میں اقبال نے ۱۹۰۲ء میں کہاں پیش کیا تھا "بانگِ درا" کا ابتدائی حصہ اس موضوع سے خالی ہے اور "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء میں چھپی۔

یہاں اس بات کو قدرے تقویت دینے کے لیے کہ داغ کی انگلی پکڑ کر چلتے چلتے اقبال اس انگلی کو چھوڑ کر تنہا بھی اپنی رفتار سے چلنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ میں داغ کی ایک اور غزل کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ داغ کہتے ہیں:

کئی دن سے خوش آمد کر رہا ہے آسماں میری
الٰہی دل ہی دل میں گھٹ کے رہ جائے فغاں میری

اقبال نے اس زمین میں غزل نہیں کہی بلکہ اس زمین میں انہوں نے اپنی نظم "تصویرِ درد" کی ابتدا کی:

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

اقبال کی یہ نظم ۱۹۰۴ء کی ہے جب کہ اقبال ابھی یورپ روانہ نہیں ہوئے تھے۔ داغ مرحوم زندہ تھے اور اقبال اُن سے اصلاح لے رہے تھے اور یہیں سے اقبال کے اس Tension کی ابتدا ہوتی ہے جو لندن پہنچ کر اس میدانِ خیال پر منتج ہوا کہ اب مجھے شاعری ترک کر کے کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جو ملک و قوم کے لیے مفید ہو، لیکن لندن کے اس واقعے کا ذکر سیاق و سباق کے ساتھ دور ابعد میں آئے گا۔

مذکورہ نظم "تصویرِ درد" میں ایک شعر ہے:

اُڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

داغ کی غزل میں ایک شعر آتا ہے:

گئے تھے سیر کو گلشن کی دونوں لٹ کے آئے ہیں
ادا ان کی اڑائی گل نے بلبل نے فغاں میری

"تصویرِ درد" کی تاریخ کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ داغ کی بعض زمینوں میں اقبال نے بہت بعد میں بھی شعر کہے ہیں لیکن ان پر رنگِ داغ کا اثر نظر نہیں آتا۔ مثلاً داغ کی یہ غزل دیکھیے:

کچھ اس کو وہم کچھ اس کو غرور رہتا ہے
الگ تھلگ وہ بہت دور دور رہتا ہے

اور اقبال کا بہت بعد کا ایک قطعہ ہے:

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اس مقالے میں اقبال کے اس طرح کے کلام کو جو داغ کی زمینوں میں ہے لیکن ۱۹۰۸ء کے بعد کا ہے، موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا۔ ۱۹۰۴ء کی "تصویرِ درد" کا ذکر اس لیے خاص طور سے کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۴ء، ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء اقبال کی شاعری میں ایک معنی خیز موڑ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اس موڑ کا بالتفصیل ذکر کرنے سے پہلے داغ کی شاعری کے متعلق دو ایک باتیں عرض کرنا ضروری ہے جن کا ذکر اس مقالے میں ذرا پہلے ہونا چاہیئے تھا۔

(۷)

احسن مارہروی داغ کے دیوان چہارم "یادگارِ داغ" کے مقدمے میں لکھتے ہیں "کوئی صاحب ان کی شاعری کو عیاشانہ فرماتے ہیں، کوئی سوقیانہ، کوئی جاہلانہ۔ حالانکہ ان کی اور صرف ان کی وہ شاعری ہے جو زمانے کے حسبِ حال اور موجودہ طبائع کا فوٹو ہے۔" یہاں احسن مارہروی کے تبصرے پر بحث مقصود نہیں ہے۔ لیکن اتنا کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ داغ کی شاعری کو صرف کھیل کھیلنے کی شاعری یا عیاشانہ شاعری، یا سوقیانہ شاعری کہہ کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ داغ کی نظر میں وہ اجتماعی زندگی نہیں تھی جو اس وقت اکبر الٰہ آبادی اور حالی کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی۔ لیکن داغ نے اپنی شاعری کا جو رخ پیش کیا وہ کوئی زندگی سے کٹا ہوا پہلو نہیں ہے۔ یہ اس زندگی کا رخ ہے جو صرف داغ ہی بسر نہیں کر رہے تھے بلکہ ہمارے معاشرے کا جزو بن چکی تھی۔ ہمارے ایک نقاد لکھتے ہیں کہ "غور و فکر سے تو انہوں نے (داغ) کبھی کام ہی نہیں لیا اس لیے ان کے یہاں تفکر اور فلسفے کے رونما ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" راقم التحریر کے نزدیک یہ رائے تضاد بیانی کا شکار ہے۔ شاعری میں غور و فکر سے کام نہ لینا بالکل دوسری بات ہے اور متفکرانہ یا فلسفیانہ مضامین باندھنا دوسری بات اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ داغ نے کبھی غور و فکر سے کام نہیں لیا اور ان کی شاعری کو ہم صرف عیاشانہ یا ہوسناکی اور رندی کے موضوعات ہی میں مقید کر لیتے ہیں تو ان کے یہ اشعار کس موضوع کی شاعری کے تحت آئیں گے:

اے داغ کسی طرح سے یہ کم نہیں ہوتی
انسان کو برباد کیا حرص و ہوا نے

میں وضع کا پابند ہوں گر جان بھی جائے
جب کوئی بلانے نہیں آتا، نہیں جاتا

دینے کا ہاتھ کم نہیں لینے کے ہاتھ سے
بڑھتا ہے دستِ جود وہی سائل کے سامنے

اب گردشِ فلک کا طریقہ ہی اور ہے
آنکھیں کھلیں زمانے کی رفتار دیکھ کر

فلک دیتا ہے جن کو عیش اُن کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

اے بے خودیٔ شوق ہماری ہے یہ ہستی
دنیا میں ہیں اس طرح کہ دنیا میں نہیں ہیں

ذرا اپنے گریباں میں تو وہ منہ ڈال کر دیکھیں
ہوئے ہیں دوسروں کی جو برائی دیکھنے والے

حد سے نکتہ چیں یا عیب ہیں غیروں کے ہوتے ہیں
بہت کم دیکھے آپ اپنی برائی دیکھنے والے

اللہ رے کشاکشِ دیر و حرم کہ میں
ظالم ہزار ہاتھ سے دامن دریدہ ہوں

داغ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا
جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی

مر گئے خسرو و جمشید سے میکش لاکھوں
رونقِ ساغر و آرائشِ محفل ہے وہی
جو کہے داغِ سیہ مست وہ لکھ لو دل پر
اس خرابات میں اک مُرشدِ کامل ہے وہی

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

یہ ہوسناکی اور رندی کی شاعری نہیں ہے اس سے اقبال پر داغ کے اثرات ڈھونڈنے کے لیے ہمیں کلام داغ کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا ہوگا۔ اقبال کو کلام داغ میں رندی اور ہوسناکی یا کھیلنے والی شاعری کے علاوہ اور بھی کچھ نظر آیا ہوگا۔ حمد اور نعت بھی، اخلاقیات کے مضامین بھی اور اردو زبان آتے آتے والی یا ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے والی بھی۔

(۸)

۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۴ء تک کی جس مدت میں اقبال اپنی وہ غزلیں کہہ رہے تھے جن کا ذکر سطور بالا میں تفصیل سے آیا ہے اسی زمانے میں اقبال نے اپنی مندرجہ ذیل نظمیں بھی کہیں: نالۂ یتیم، ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے، ہمالہ، گل رنگیں، عہد طفلی، مرزا غالب، ابر کوہسار، خفتگان خاک سے استفسار، اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے، شمع و پروانہ، عقل و دل، صدائے درد، آفتاب، شمع، ایک آرزو، آفتاب صبح، درد عشق، گل پژمردہ، سید کی لوح تربت، ماہ نو، انسان اور بزم قدرت، پیام صبح، عشق اور موت، زہد اور رندی، شاعر، فریاد امت، موج دریا، رخصت اے بزم جہاں، طفل شیر خوار، تصویر درد، نالۂ فراق، چاند، بلال، سرگزشت آدم، ترانۂ ہندی، جگنو، صبح کا ستارا، نیا شوالہ، داغ، ابر، ایک پرندہ اور جگنو، بچہ اور شمع، کنار راوی، التجائے مسافر، برگ گل، نعت، معراج، جوہر ایمان، خطاب بہ مسلم، شیشۂ ساعت کی ریگ وغیرہ۔ ان نظموں میں داغ کا اثر دور دور تک نظر نہیں آتا۔ غالباً اس وقت اقبال بطور شاعر کے دو حصوں میں منقسم تھے۔ ایک غزل کا شاعر اور ایک نظم کا شاعر۔ دراصل اقبال نے جب شاعری کی ابتدا کی تو وہ دور ایسا ہی تھا کہ اساتذہ کی زمینوں میں غزل کہنا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ اقبال بھی اسی روش پر چل تو پڑے لیکن اس روش سے اطمینان نہ پا سکے۔ یہ ایک تقلید کی روش تھی۔ جو اقبال کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ ان کا یہ مصرعہ پہلے بھی آچکا ہے اُسی زمانے کا ہے —— تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی —— وہ نئے رستوں کی تلاش میں تھے لیکن خضر کی رہنمائی انہیں گوارا نہیں تھی۔ وہ اپنی راہ سفر کو اپنی ہی تجلی سے روشن دیکھنا چاہتے تھے۔ خدا جانے اس سوچ بچار کے دور میں وہ کس ذہنی کشمکش اور عالم کرب سے گزرے ہوں گے۔ راقم التحریر نے لندن کے جس واقعے کا ذکر سطور بالا میں کیا ہے وہ شیخ سر عبدالقادر کی زبان سے سنیے "ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اسے کسی اور کام میں صرف کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کر دینا چاہیے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترک شعر

کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جاتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کا چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے:

اس عبارت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر پروفیسر آرنلڈ آڑے نہ آتے تو اردو ادب اقبال کی ۱۹۰۵ء کے بعد کی شاعری سے محروم رہ جاتا اور اقبال شعر کہنے کے عوض کسی اور "مفید کام" میں مصروف ہوتے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاعری ایک ارادی فعل ہے اور پھر اقبال ایسے شاعر کی شاعری۔ اس ضمن میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ جسے شیخ صاحب نے اقبال کا مصمم ارادہ کہا ہے۔ وہ مصمم ارادہ نہیں ہوگا۔ وہ محض ایک وقتی کیفیت ہوگی۔ اقبال اس وقت دورا ہے پر تھے وہ اپنی شاعری کے اس پہلو سے بیزار ہو رہے تھے جس میں فکری اعتبار سے، ساختیاتی اعتبار سے اور موضوعی اعتبار سے داغ کی تقلید موجود ہے۔ لیکن داغ سے عقیدت انہیں اس شاعری سے دامن چھڑانے بھی نہیں دیتی تھی۔ یوں تو شیخ عبدالقادر نے بھی اقبال سے کہا کہ "ان کے کلام میں وہ تاثیر موجود ہے جس سے ممکن ہے ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے" اور آرنلڈ نے بھی یہی کہا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی —— لیکن کیا اقبال اس حقیقت سے واقعی بے خبر تھے اور اسی بے خبری کے عالم میں انہوں نے ترکِ شعر کا مصمم ارادہ کر لیا تھا! کیا انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس غزل کے قطعے میں انہوں نے کہا:

مدیرِ "مخزن" سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اس کے تمام اشعار داغ کے اسلوبِ سخن، طریقِ اظہار و ابلاغ یا اندازِ بیان سے بالکل آزاد ہیں اور وہ اشعار یہ ہیں:

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

ملا محبت کا سوز مجھ کو تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو تری کوئی انجمن نہیں ہے

یہاں کہاں ہمنفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے جو زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمودِ ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

یہ قیامِ یورپ کی غزل ہے لیکن اقبال کے یہاں نظر باقی شاعری کی ابتدا اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ نظم میں تو خیر مثالیں دینے کی ضرورت ہی نہیں غزل میں بھی اقبال کا یہ اندازِ فکر کہیں نمایاں اور کہیں غیر نمایاں طریقے پر اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ مثلاً

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے!

جرس ہوں نالہ ہے خوابیدہ میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ راہِ حجاز کرے

اور پھر وہ غزل آتی ہے جس میں اقبال کے یہ اشعار پرانی طرز کی غزل گوئی سے بیزاری اور نئے رستے کے تجسس کی نشاندہی کرتے ہیں:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بے جا بھی چھوڑ دے
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لاتے جو مدعے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

اگرچہ کسی ایک غزل یا دو غزلوں کو کسی بھی شاعر کے فکری موڑ کا سنگِ میل قرار دینا آسان بھی نہیں اور تنقیدی تقاضوں کو پورا بھی نہیں کرتا لیکن ۱۹۰۵ء کی مذکورہ بالا غزل اور ۱۹۰۶ء کی وہ غزل جس کا ذکر پہلے آچکا ہے:

ملا محبت کا سوز مجھ کو تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو تری کوئی انجمن نہیں ہے

دراصل اس احساسِ محرومی اور اس سے پیدا ہونے والی تڑپ کا اظہار ہیں کہ میری غزل ابھی تک اجتماعی زندگی کے عرفان سے بیگانہ ہے۔ میں جس رستے پر گامزن ہوں یہ رسمی اور روایتی غزل کا رستہ ہے اگرچہ وہ اس حقیقت سے بھی ناآشنا نہیں تھے کہ داغ نے انہیں کلاسیکی شعری روایت میں رچے بسے اسلوب سے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے اور بقول سید عابد علی عابد "روایت کا طالب علم داغ کے کلام میں شعری علائم و رموز کی آخری ارتقا یافتہ شکل دیکھ سکتا ہے۔"

اب اس مذکورہ غزل کے بعد کی غزل دیکھیے:

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

فتح محمد ملک نے اقبال کی اس غزل کو اقبال کی نئی شاعری کا منشور کہا ہے اور یہی وہ غزل ہے جس میں اقبال روایتی ادب سے اور اس غزل سے جو وہ داغ کے زیرِ اثر کہتے رہے ہیں بیزاری کا پھر ایک بار اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

"بانگِ درا" کے اسی حصے (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک) میں ایک غزل پر اقبال نے خاص طور سے تاریخ درج کی ہے مارچ ۱۹۰۷ء اس غزل کا مطلع ہے:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

ظاہر ہے کہ پرانی اصطلاحیں استعمال کر کے بھی اقبال رمز و ایما کے پردے میں سیاسی طور پر بہت کچھ کہہ گئے ہیں یہ اشعار اسی غزل میں آتے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

گویا دس بارہ برس تک داغ کے اثرات پوری طرح قبول کرنے کے بعد اقبال اب ان اثرات سے شعوری طور پر پوری طرح آزاد ہو چکے تھے۔

داغ کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ ہمیں اس بات سے خالی الذہن نہیں ہونا چاہیے کہ یہ وہ وقت تھا جب اقبال اپنی منزل میں انقلابی تبدیلیوں کی دہلیز پر کھڑے تھے لیکن استاد کی موت ایک ایسے شاگرد کے لیے جس کے دل میں استاد کی محبت اور عقیدت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو، ایک طوفانِ غم سے کم نہیں۔ چنانچہ اس غم و اندوہ کی انتہائی شدت کے عالم میں انہوں نے داغ کا مرثیہ کہا جس نے شخصی مرثیے کی صنف میں ایک نئے رجحان کا اضافہ کیا۔

اس مرثیے میں اقبال جوشِ عقیدت میں یہاں تک کہہ گئے:

جو ہر معجز نمائی پا چکا جس دم خیال
پھر نہ ہو سکتی تھی پیدا میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر
داغ یعنی وصل فکرِ میرزا اور دردِ میر

لیکن جب اس نظم کو "بانگ درا" میں شامل کرنے کا وقت آیا اور اقبال نے اس نظم میں مندرجہ خیالات پر غور کیا تو غالباً اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ یہ دو شعر محض میری عقیدت کا نتیجہ ہیں اور ان میں مبالغے کا وہی عیب موجود ہے جسے "غلو" کہتے ہیں اور جو داغ کی شاعری کا طرۂ امتیاز سہی لیکن اقبال کی شاعری میں حلقہ بیرونِ در کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اقبال کو اس حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ داغ کا کلام میرزا غالب کی فکر اور میر درد کے در و دیوار کا مقامِ اتصال نہیں ہے۔ نہ تو داغ میں "پرمرغِ تخیل کی رسائی" ہے اور نہ ہی میر تقی میر والی کیفیت گداز ہے اس لیے انہوں نے یہ دونوں شعر اپنی نظم سے خارج کر دیئے۔ صرف یہی نہیں کہ کلامِ داغ کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے وہ بنیادی طور پر دوسرے شعراء کے محاسنِ کلام بیان کرتے ہیں جن سے داغ کا کلام خالی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

اور دکھلائیں گے مضمون کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
نکتۂ دوراں کے نقشے کھینچ کر دکھلائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی

سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

گویا داغ کے کلام میں مضمون کی باریکیاں بھی مفقود ہیں، فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں بھی نہیں ہیں، "تلخیِ دوراں کے نقوش اور تخیل کی نئی دنیاؤں سے بھی کلامِ داغ خالی ہے اور بلبلِ شیراز والی بات بھی نہیں ہے ـــــ اور تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے:

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون

اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

گویا واضح لفظوں میں داغ کا کمالِ فن اقبال کے نزدیک عشق کی تصویر کھینچنا ہے اور یہ عشق رومی والا عشق نہیں یا وہ عشق نہیں ہے جسے بعد میں اقبال کے نظریۂ عشق کی تفسیر بننا تھا۔ بلکہ جلسی عشق ہے۔ اور وہ بھی طوائفوں یا آبرو باختہ عورتوں کے ساتھ والا عشق، اسی نظم کے متروک اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے:

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی

آہ! دل سوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

تو اس تجزیے کے بعد اقبال کہاں تک داغ کے رنگِ سخن سے چمٹے رہے:

آخر میں داغ کے اقبال پر اثرات کے بارے میں ایک بات اور بھی عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس مقالے میں استادِ محترم سید عابد علی عابد کی اس رائے کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ کہ "روایت کا طالب علم داغ کے کلام میں شعری علائم و رموز کی آخری ارتقا یافتہ شکل دیکھ سکتا ہے۔" سید عابد علی عابد کی پوری عبارت یہ ہے "غزل کی شعری روایت جس میں ولی سے لے کر میر تک اور میر سے لے کر غالب تک ترمیم و تغیر ہوتا رہا تھا۔ داغ کے زمانے تک پہنچ کر گویا سنگ بستہ اور ساکن ہو گئی۔ اس سے شعری روایت کو نقصان ضرور پہنچا کہ آگے بڑھنے کے امکانات نہیں رہے لیکن یہ فائدہ بھی پہنچا کہ روایت کا طالب علم داغ کے کلام میں شعری علائم رموز کی آخری ارتقا یافتہ شکل دیکھ سکتا ہے":

یہ خاکسار استادِ محترم کی گراں قدر رائے کے اس حصے سے متفق نہیں ہے کہ آگے بڑھنے کے امکانات نہیں رہے تھے۔ اسے اس ضمن میں یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں تک اقبال کے علاوہ داغ کے باقی شاگردوں کا تعلق ہے مذکورہ شعری خصوصیات کی ترقی کے امکانات واقعی ختم ہو چکے تھے کیونکہ ان شعرا نے اپنی غزل میں رموز و علائم، تشبیہ و استعارہ اور صنائع بدائع ہی کو مقصود بالذات سمجھا لیکن اقبال نے ان خصائص شعری کو مقصود بالذات نہیں سمجھا۔ بلکہ شاعری کے حسن میں اضافہ کرنے کا اور شاعری کا مرتبہ بلند کرنے کا ایک وسیلہ سمجھا اس لیے اقبال کے یہاں ان خصوصیات کے بہتر استعمال کے امکانات ختم نہیں ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی اصل بحث کے دوران میں استادِ محترم نے اس نئی معنویت کی جانب اشارہ کیا ہے جو اقبال نے ان رموز و علائم کو بخشی لیکن انہوں نے اس معنویت کو اقبال کے سیاسی، ملی اور فلسفیانہ افکار کے ابلاغ و اظہار تک محدود

رکھا ہے۔

اقبال کی ان غزلوں میں جو قریب قریب سو فیصد داغ کے رنگ میں کہی گئی ہیں اور جنہیں (دو تین کو چھوڑ کر) اقبال نے اپنے کلام سے خارج کر دیا۔ واقعی مذکورہ خصوصیات شعری کے حسن میں اضافے کا امکان ہر اعتبار سے ختم ہو چکا تھا لیکن ان غزلوں کے بعد اقبال کی غزل کا ایک اور دور آتا ہے۔ یہ بھی ۱۹۰۵ء سے پہلے ہی کی غزلیں ہیں مثلاً

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کے لیے
کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیوں کر ہوا
انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں
مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے۔

یہ وہ غزلیں ہیں جن میں داغ ہی کے رموز و علائم کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ غزلیں سب کی سب تین چار اشعار کو چھوڑ کر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، غمِ جاناں اور غمِ ذات کے گرد گھومتی ہیں۔ ان میں ما بعد الطبعیات اور تصوف کے مضامین بھی ہیں (اجتماعی شعور کی بو باس ان میں نظر نہیں آتی) لیکن یہ غزلیں اثرات داغ کی دین ہونے کے باوجود داغ کی غزلوں سے مختلف ہیں۔ ان کی زبان و بیان، ان کا لب و لہجہ، ان کا اسلوب داغ کا لب و لہجہ یا داغ کا اسلوب نہیں ہے۔ میری ناقص رائے میں یہ اقبال کی غزل کا عبوری دور ہے۔ انور سدید اور رفیع محمد ملک نے اقبال کی ان غزلوں کو عبوری دور کی غزلیں کہا ہے جو ہر اعتبار سے یا قریب قریب ہر اعتبار سے داغ کے رنگ میں ہیں اور جن کی مثالیں اس مقالے کے شروع میں دی جا چکی ہیں مثلاً "دو پٹہ سنبھال کے" یا "عشق بھی نہ کھائیں ہم" وغیرہ۔ راقم التحریر کے نزدیک یہ دور اقبال کی غزل کا عبوری دور نہیں ہے۔ یہ بالکل ابتدائی دور ہے۔ عبوری دور وہ ہے جس میں اقبال نے مذکورہ غزلیں کہیں جن کے چند اشعار یہ ہیں:

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی زمین سے آسماں تک ہے

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

بزمِ ہستی اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

شوخی سی ہے سوالِ مکرّر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

جنہیں اقبال نے "بانگِ درا" میں شامل کیا اور جن کا ذکر چند سطور قبل بھی آچکا ہے۔

اکثر نقادوں کا یہ خیال ہے کہ جگر کی شاعری داغ کی شاعری کا ایک ترمیم یافتہ یا نیا روپ ہے۔ یعنی جگر نے داغ کی زبان استعمال کر کے رسمی اور عامیانہ خیالات کو مقابلتاً ایک مہذب صورت دی ہے۔ اس خیال کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر ہم اقبال کی مندرجہ بالا غزلوں کی ساخت، ان میں داغ کے رموز و کنایات اور اسالیبِ بیان کا استعمال دیکھیں تو یہ بات نظر آجاتی ہے کہ یہ دراصل داغ کی ہی شاعری ہے جسے اقبال نے ایک جدید صورت ہی نہیں بلکہ اسے ایک

Ennabled Form میں پیش کیا ہے۔ داغ کے پیش پا افتادہ مضامین اقبال کے یہاں ارفع اور اعلیٰ قدروں کے حامل بن گئے ہیں۔ ذکرِ محبوب اور اپنی ذات کا غم جو داغ کے یہاں عیاشانہ یا فاسقانہ یا سوستا کی اور رندی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اقبال کے یہاں آکے ایک ذہنی کرب کی شدت احساس کا حامل ہوگیا ہے اور اس شاعری سے بالکل مختلف ہوگیا ہے جسے کھل کھیلنے کی شاعری یا نفسانی خواہشات کی شاعری کہا جائے اور جس کی مثالیں اقبال کے پہلے دور کی شاعری میں موجود ہیں۔

عبوری دور در اصل اقبال کی غزل کا دوسرا دور ہے۔ اقبال نے اگر ان غزلوں کو "بانگ درا" میں ۱۹۰۵ء تک کے دور میں شامل کیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ ہم انہیں ان غزلوں میں شامل کریں جنہیں اقبال نے "بانگ درا" مرتب کرتے وقت اپنے کلام سے خارج کر دیا خواہ دونوں کا دور قریب قریب ۱۹۰۵ء تک ہی کا دور کیوں نہ رہا ہو۔

تیسرا دور وہ ہے جو اس غزل سے شروع ہو رہا ہے:

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ پانچ شعر کی غزل ہے اور اس کا ذکر محض ایک ترتیبِ زمانی پیش کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ورنہ دراصل اس ضمن میں قابلِ ذکر غزل اس کے فوراً بعد کی غزل ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اس غزل سے لے کے ۱۹۰۸ء کی آخری غزل تک:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررِ فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اقبال کی غزل کا تیسرا دور ہے۔ یہ بھی عبوری دور ہے اور اس لیے کہ عبوری دور کے پہلے حصے میں اقبال کی غزل تغزل کے حسن اور رچاؤ اور درد و گداز کی کیفیت سے مالا مال ہے لیکن اجتماعی شعور سے جس نے آگے چل کر اقبال کی غزل کو ایک انفرادیت دی، بے گانہ ہے اور اس دوسرے حصے کی غزل بڑی حد تک اجتماعی شعور کے حسن سے اور درد و بشر کی کیفیت سے لبریز ہے لیکن اس میں رچے ہوئے تغزل کی کمی ہے۔

یہ دور بحیثیت مجموعی ۱۹۰۸ء پر آکر ختم ہو جاتا ہے اور ۱۹۰۹ء میں اقبال کی غزل کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس پر ہر اعتبار سے اقبال کے فکر و فن کی چھاپ ہے۔ اس دور کی بعض غزلیں یہ ہیں:

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تو جو بجلی ہے تو یہ چمک پنہاں کب تک
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

تو خاک کی مٹھی ہے اجسنہ اکی حرارت سے
برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

ظاہر ہے کہ یہ غزلیں داغ کے اثر سے بالکل معرّا ہیں اور یہ وہ غزلیں ہیں جن کا رشتہ "زبورِ عجم" سے ہوتا ہوا "بالِ جبریل" کی غزلوں سے جا ملتا ہے اور ۱۹۳۸ء تک جب کہ بعض موقعوں پر اقبال کی نظم بھی ہر اعتبار سے تغزل میں ڈھل جاتی ہے داغ کا اثر کہیں نظر نہیں آتا۔ ہاں اگر کا شعر کی بات دوسری ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ مصرع یا ایک آدھ شعر اقبال کی فارسی شاعری میں ایسا نظر آجاتا ہے جو ہمیں داغ کے اسلوبِ بیان کی یاد دلا جاتا ہے۔ مثلاً

حسرتِ جلوۂ آں ماہِ تماشے دارم
دست بر سینہ نظر برلبِ بامے دارم

بر سرِ بام آ نقاب از چہرہ بے باکانہ کش!
نیست در کوئے تو چوں من آرزو مندِ دگر

از ما بگو سلامے آں ترکِ تُند خورا
کآتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را

کو آں نگاہِ نازکہ اول دلم ربود
عمرت دراز باد! ہمہ تیرم آرزوست

باز بہ سر مرتاب وہ چشمِ کرشمہ زائے را
ذوقِ جنون دو چند کن شوقِ غزل سرائے را

عذرِ گناہ کردم و دل در کنارِ من
آہے کشید و گفت کہ تعزیرم آرزوست

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں
دلبراں زہرہ وشاں گلبدناں سیم براں

تخلیقِ شعر میں کسی دوسرے شاعر کا اثر قبول کرنا کوئی بجلی کے بٹن کا سا معاملہ نہیں ہے کہ اسے آن کر دیں تو بلب روشن ہو جائے اور آف کر دیں تو بلب بجھ جائے۔ مزاج اور طبیعت میں ایک بار سرایت کیا ہوا اثر بالعموم زندگی بھر کا ساتھی بن جاتا ہے۔ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ ہاں بڑے شعرا چونکہ کئی اطراف سے اثر قبول کرتے ہیں اور ان کے اندر اپنا انفرادی رنگ پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس لیے ان کے کلام کے ہر شعر اور ہر مصرعے میں کسی ایک شاعر کے اثرات کی نشاندہی ممکن نہیں اور پھر جب ان کا اپنا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے تو دوسروں کے اثر کی تلاش ایک فعلِ عبث بن جاتی ہے۔ ویسے

میرے سامنے اگر کوئی داغ کا یہ مصرعہ پڑھے ـــــ چمپا کھلی، گلاب کھلا، موتیا کھلی ـــــ اور پھر اقبال کا یہ مصرع ـــــ نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید ـــــ تو مجھے اسے بھی اقبال پر داغ کا ایک غیر محسوس یا خفیف سا اثر کہنے میں تامل نہ ہوگا۔

اور یہ جو فارسی کے چند اشعار کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ داغ کی براہ راست اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔ اور پھر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے اشعار یا مصرعے کلام اقبال میں ایک تو مستثنیات کی جنت رکھتے ہیں۔ دوسرا اس طرح کے اشعار پڑھتے وقت مجھے اقبال کا یہ مصرع اکثر یاد آجاتا ہے:

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو